

رموزِ بجنودی۔ اجتماعی خودی کی تشکیل

ڈاکٹر عبدالمغنی

اسرارِ خودی میں فرد کی خودی کے بیانات کے ساتھ ساتھ جماعت کی خودی کے اشارات بھی پائے جاتے ہیں سب سے بڑھ کر انفرادی خودی کے بیان میں جو گہرائی اور توازن نیز سنجیدگی اور بلندی ہے اس سے اجتماعی خودی کا ایک بلیغ اشارہ ملتا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اقبال کا نظریہ خودی ان کے تصورِ خدا پر مبنی ہے، یہ عقیدہ توحید ہی ہے جو انسان کی حریت و اخوت دونوں کا ضامن ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نے جس طرح افراد کی تخلیق و تعلیم کی ہے اسی طرح ملت کی تشکیل و تربیت بھی اور اس وسیع پیمانے پر تعمیرِ حیات کے لیے خدا نے جس اصول کو پسند کیا ہے وہ اسلام ہے یعنی خدا کی بندگی کا قانونِ فطرت جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس آفاقی نقطہ نظر سے فرد جماعت کی خودی و بے خودی باہم دگر پیوستہ ہیں اور دنیا میں زندگی کا سارا نغمہ ان کی ہم آہنگی سے پھوٹا ہے۔ لہذا اسرارِ خودی کے صرف تین سال بعد ۱۹۱۸ء میں اقبال نے رموزِ بیخودی تصنیف کی۔ دوسری کتاب پہلی کتاب کا تتمہ یا مکملہ ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک ہی کتاب کے دو حصے ہیں۔ اس معاملے میں اقبال کے عقیدہ توحید کے ساتھ ہی ان کا عشقِ رسولؐ بھی ایک فیصلہ کن امر ہے۔ ان کے مومن قلب و دماغ کی ترکیب توحید و رسالت کے مشترک تصورات سے ہوئی ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول دونوں نظریہ خودی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ چنانچہ انسان کی خودی کے اثبات و اظہار کا وسیلہ ملت اسلامیہ ہے، جو خدا کے آخری پیغام کی حامل اور ختم الرسل کی شریعت کی علم بردار ہے۔ نہ صرف ملت کے ذریعے بلکہ ملت کے لیے بھی خودی کا فرما ہوتی اور اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ اقبال کے فلسفیانہ افکار کا مقصد ہی ملت کی شیرازہ بندی اور ترقی ہے، جسے وہ عام انسانیت کی وحدت و نہضت کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ فرد جس طرح اپنی شخصیت کے فروغ کے لیے اسرارِ خودی کا عرفان حاصل کر سکتا ہے اسی طرح ملت کے ارتقا کے لیے اسے رموزِ بیخودی کا شعور حاصل کرنا چاہیے۔ فرد کی خودی کائنات کے مقابلے میں ہے، جب کہ اس کی بے خودی ملت کے مقابلے میں ہے، وہ کائنات

کی تسخیر کرتا ہے اور ملت کی خدمت۔

رموز بیخودی کا دیباچہ ”پیش کش بحضور ملتِ اسلامیہ“ ہے۔ اس میں ملت کو اپنی حقیقت سے بیگانہ وشی پر تنبیہ کی گئی ہے اور قائمِ ملت کے ساتھ وفائے عہد کی تلقین:

اے نظر بر حسن ترسا زادہ اے ز راہ کعبہ دور افتادہ
طرح عشق انداز اندر جان خویش تازہ کن با مصطفیٰ پیمان خویش

اے ملتِ اسلامیہ! تیری نگاہیں مسیحیت کے چہرے پر بھٹک رہی ہیں اور تو راہِ کعبہ سے دور جا پڑی ہے، اپنی روح ک اندر جذبہٴ عشق پیدا کر اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے کیے ہوئے پیمانِ وفا کی تجدید کر۔“
اس کے بعد شاعر خود اپنے عشق کا ذکر کرتا ہے، جو خدا اور رسول اور ملتِ اسلامیہ تینوں کے لیے ہے۔ وہ اپنی ملت کے دل میں اپنے اسی عشق کی آگ ڈال دینا چاہتا ہے یعنی اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لیے وقف کرتا ہے:

من ہمیں یک گل بہ دستارت زخم محشرے بر خواب سرشارت زخم
تاز خاکت لاله زار آید پدید از دمت باد بہار آید پدید
میں اپنے اسی عشق کے شعلے کا پھول تیری دستار میں لگاتا ہوں، تاکہ تو اپنے خواب شیریں سے بیدار ہو اور تیری خاک سے دنیا میں ایک لالہ زار اُگے، جس میں تیرے دم سے بادِ بہار چلے۔

کتاب کی ”تمہید“ میں ”رابطہ فرد و ملت“ کا معنی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں رابطہٴ جماعت کو فرد کے لیے ایک رحمت قرار دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ فرد کی خودی کا جوہر ملت ہی کے ساتھ مربوط ہو کر اپنے کمال کو پہنچتا ہے، پھر فرد و ملت کی باہمی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں خوبصورت شاعرانہ تصویروں کے علاوہ فکر انگیز فلسفیانہ نکتے پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں خودی و خدا کے رشتے واضح کر کے ملت کی خودی کا ایک آفاقی و عملی تناظر قائم کیا گیا ہے:

فرد را ربطِ جماعت رحمت است جوہر او را کمال از ملت است
فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند سلک و گوہر، کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود قطرہٴ وسعت طلب قلمزم شود
وصلِ استقبال و ماضی ذات او چوں ابد لا انتہا اوقات او
فرد تنها از مقاصد غافل است قوتش آشننگی را مائل است
قوم باضبط آشنا گرداندش نرم رو مثل صبا گرداندش

در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گل برگ چمن گردد خودی
فرد و قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں، ان کا رشتہ سلک و گوہر اور کہکشاں و اختر کا ہے، فرد کی عزت ملت کے تعلق سے ہے اور ملت کا نظام افراد پر قائم ہے، فرد جب جماعت سے پیوستہ ہوتا ہے تو گویا قطرہ پھیل کر سمندر بن جاتا ہے، حال کے ساتھ ہی ماضی و مستقبل بھی فرد کی شخصیت کے حصے ہیں اور اسی جامعیت کے باعث اس کے اوقات لامتناہی ہیں، فرد تنہا ہو کر مقاصد سے غافل ہو سکتا ہے اور پراگندگی کی طرف مائل، مگر قوم اسے ضبط و نظم سے آشنا کرتی اور نتیجتاً اس کے اندر نسیم و صبا جیسی لطافت پیدا کرتی ہے، خودی جماعت کے اندر رہ کر خود شکن ہوتی ہے اور ایک برگ گل سے پورا گلستان پیدا کرتی ہے۔

ملت و نبوت

فرد و ملت کے ربط باہمی کی اہمیت واضح ہے، فرد کی نمود جماعت کی سطح پر ہی ہوتی ہے، وہ کسی ملت کے باغ کا ہی ایک پھول ہوتا ہے، گرچہ اس کے مزاج میں یکتائی کا جوش ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی سے ہوتا ہے، ستاروں کی محفل باہمی کشش سے ہی قائم ہے:

در جماعت فرد را بنییم ما از چمن او را چو گل چینیم ما
فطرتش وارفتہ یکتائی است حفظ او از انجمن آرائی است
محفل انجم ز جذب باہم است ہستی کوکب ز کوکب محکم است
لیکن کبھی ملت بھی بے جان ہو جاتی ہے، اس کے اندر تن آسانی، بزدلی اور بے ہستی پیدا ہو جاتی ہے، وہ عزم و آرزو سے محروم نظر آتی ہے، محنت سے جی چراتی ہے، اوہام میں مبتلا ہوتی ہے، اس کی خودی مجروح بلکہ غائب ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں خدا پیغمبر کو بھیجتا ہے جو ملت کو ایک کتاب دیتا اور حیات تازہ بخشتا ہے، اسے ایک نیازاویہ نظر عطا کرتا ہے اور ہستی کے ایک نئے گلستان کی طرح ڈالتا ہے:

سست و بے جاں تار و پودِ کار او	ناکشودہ غنچہ پندار او
گوشمال جستجو ناخوردہ	زخمہ ہائے آرزو ناخوردہ
بیم جاں سرمایہ آب و گلش	ہم ز باد تند می لرزد دلش
منزل دیو و پری اندیشہ اش	از گمان خود رمیدن پیشہ اش
جان او از سخت کوشی رم زند	بچہ در دامن فطرت کم زند
تا خدا صاحب دلے پیدا کند	کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پروازے کہ از آوازہ	خاک را بخشد حیات تازہ

تازہ اندازِ نظر پیدا کند گلستان در دشت و در پیدا کند
اللہ کا رسول انسان کو غیر اللہ کی پرستش سے آزادی دلاتا ہے، تاکہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی
غلامی سے نجات پائے اور اپنی ذات کی اہمیت کا شعور حاصل کرے، پھر ایک نصب العین پر اپنی توجہ مرکوز
کر کے ایک آئین کی پابندی کرے۔ اس پابندی قانون سے انسان کے اندر غرور و نخوت کے بجائے حلم و
تحمل کا مادہ پیدا ہوگا اور وہ نکتہ توحید کے فوائد سے فیض یاب ہو سکے گا:

بندہ از پاکشاید بندہ را از خداوندان ربايد بندہ را
گویش تو بندہ دیگر نہ زین بتان بے زباں کمتر نہ
تاسوے یک مدعایش فی کشد حلقہ آئین بہ پالیش می کشد
نکتہ توحید باز اموزش رسم و آئین نیاز آموزش

ملتِ اسلامی کے اساسی ارکان

اول: توحید

امت کی بنیادی وحدتِ الہ کے عقیدے پر قائم ہے، یہی وہ محور ہے جس کے گرد سارے اصول
اجتماعیت مجتمع ہیں، تصورِ توحید مرکزِ ملت ہے، اس سے ایک آفاقی ترکیب اور عالمی تنظیم پیدا ہوتی ہے، ایک
بین الاقوامی برادری بنتی ہے، جو یک سوئی کے ساتھ مشترک مقاصد کے لیے کام کرتی ہے، ایک نصب العین
کی خدمت کرتی ہے، ایک مٹھ نظر کے مطابق حرکت میں آتی ہے، اس کی سرگرمیوں کی ایک جہت ہوتی
ہے، اس کا سفر ایک منزل کی طرف ہوتا ہے، دلوں میں یقین ایک خدا پر ایمان سے محکم ہوتا ہے، اسی یقین
سے یک رنگی و ہم آہنگی اور اخوت و مساوات پیدا ہوتی ہے، حق و باطل کے درمیان امتیاز کا ایک معیار نصیب
ہوتا ہے، ایمان بالغیب رنگ و خوں، نسل و وطن، زبان و تہذیب اور دولت و مرتبت کے بے جا امتیازات ختم
کر کے ایک متحد و متفق ملت کا قیام عمل میں لاتا اور اسے مضبوط بنیادوں پر مستحکم کرتا ہے، ملت کے اندر حکمت
و بصیرت اور سعی و عمل کے سارے سوتے توحید ہی سے پھوٹتے ہیں، ایمان باللہ سے ہی نظام و آئین اور
قوت و تمکین سب کچھ میسر آتے ہیں:

دیں از او حکمت ازو، آئین ازو زور ازو، قوت ازو، تمکین ازو
پست اندر سایہ اش گردد بلند خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات چشم می بیند ضمیر کائنات
ملت بیضا تن و جاں لا الہ سازِ مارا پردہ گراں لا الہ

خوش از لب چوں بدل آید ہی
ملت از یک رنگی دل ہاتے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے
جذبہ باید در سرشت او یکے
گرنہ باشد سوز حق در ساز فکر
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ؟
برنسب نازاں شدن نادانی است
ملت مارا اساس دیگر است
حاضریم و دل بہ غائب بستہ ایم
مدعائے ما، مآل مایکے ست

زندگی را قوت افزایش ہی
روشن از یک جلوہ این سینا ستے
در ضمیرش مدعا باید یکے
ہم عیار خوب و زشت او یکے
نیست ممکن این چنین انداز فکر
بادو آب و گل پرستیدن کہ چہ؟
حکم او اندر تن و تن فانی است
این اساس اندر دل ما مضمراست
پس ز بند این و آں وارستہ ایم
طرز و انداز خیال مایکے ست

ماز نعمت ہائے او اخواں شدیم

یک زبان و یک دل و یک جان شدیم

ناامیدی اور ڈر انسان کے سب سے بڑے دشمن ہیں، جس شخص کا دل خوف خدا سے خالی ہوتا ہے وہ بزدل ہو جاتا ہے، جب کہ خدا ترس انسان کے دل میں کبھی کسی قسم کے خوف کا گزر نہیں ہوتا اور اس کی ہمت ہمیشہ بلند رہتی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر زندگی میں کوئی اُمید باقی نہیں رہ جاتی، جب کہ خدا کی رحمت کا امیدوار ہمیشہ پر اُمید رہتا ہے اور اس کا قلب آرزوؤں سے سرشار ہوتا ہے، توحید انسان کو غم و الم سے نجات دے کر اس کے اندر رجائیت اور نشاط کار پیدا کرتی ہے، غیر اللہ کا خوف ہر برائی کی جڑ ہے اور اس سے ہر قسم کی رذیل خصلتیں کردار میں سرایت کر جاتی ہیں، دنیا کا خوف شرک ہے، جس کا ازالہ صرف توحید سے ہو سکتا ہے:

مرگ را ساماں ز قطع آرزو ست
اے کہ درد زندان غم باشی اسیر
قوت ایماں حیات افزایشت
بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
ہر شر پہاں کہ اندر قلب تست
لابہ و مکاری و کین و دروغ

زندگانی محکم از لا تقنطواست
از نبی تعلیم لائحون بگیر
ورد لا خوف علیہم بایست
کاروان زندگی را رہزن است
اصل او ہم است اگر بینی درست
ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است

شرک را در خوف مضمرا دیدہ است

ایک بار تیر و شمشیر کے درمیان مکالمہ ہوا تو تیر نے شمشیر کی بہت تعریف کرنے کے بعد بتایا کہ تیر کی اپنی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ کمان سے چھوٹتا ہے تو صرف اس قلب کو چھید ڈالتا ہے جو سلیم نہیں ہوتا، لیکن مومن کے قلب سلیم سے ٹکرا کر تیر ایک قطرہ شبنم کی طرح ٹپک پڑتا ہے۔

اکبر کی کوشش الحاد کے بعد ہندوستان میں تخت شاہی سے توحید اور شرع اسلامی کا علم بلند کرنے والے اورنگ زیب عالم گیر کی خدا پرست سیرت کا ایک واقعہ نہایت سبق آموز ہے۔ ایک بار وہ بندۂ خدا صبح کی سیر کے دوران محو نماز تھا کہ ایک شیر بربرنے اس پر حملہ کر دیا، بادشاہ ذرا بھی نہیں گھبرا یا اور میدان سے تلوار نکال کر اس نے شیر کا کام تمام کر دیا، پھر عبادت میں مشغول ہو گیا۔ یہ صرف اورنگ زیب کا خوف خدا تھا جس نے شیر تک کے خوف سے اس کے قلب کو محفوظ کر دیا تھا، اس کی بے پناہ شجاعت کا راز اس کا ایمان محکم تھا، خدا کی محبت اور اس کے ڈرنے ہی بادشاہ کو مہیب سے مہیب خطرات کی طرف سے بے فکر اور ان کے مقابلے میں دلیر بنا دیا تھا، صحیح معنی میں اس کا دل شرک سے بالکل خالی اور توحید سے پُر تھا، اسی لیے اس کی خودی بلند تھی اور اس کا کردار خدا شناسی اور خود آگہی کی بنا پر استوار تھا:

خویش رادر بازو خود را باز گیر دام گستر از نیاز و ناز گیر
عشق را آتش زین اندیشه کن روبہ حق باش و شیریں پیشہ کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس
خوف غیر از شرک پنہاں است و بس

دوم: رسالت

رسالت توحید کا جزو لازم ہے۔ خدا کی وحی رسول پر نازل ہوئی اور ان کے ہی ذریعے ملت کو خدا کا پیغام اور نظام ملا۔ اس طرح رسالت کا تصور جسم ملت میں روح کی طرح جاگزیں ہے۔ اسی تصور سے دین بھی ہے، آئین بھی۔ فرد خدا کی مخلوق ہے۔ مگر ملت رسول سے منسوب ہے۔ حضرت ابراہیم نے کعبہ کی تعمیر کے وقت ملت اسلامیہ اور ختم المرسل کے ظہور کی تمنا و دعا کی تھی، جو قبول ہوئی، رسول اللہ ﷺ سے اہل ایمان کو ملی وحدت، باہمی اخوت اور اللہ کتاب ملی، جس کی حکمت و نصیحت ملت کی رگ گردن ہے:

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید وز رسالت در تن ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوین ما از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است جزو ما از جزو مالائیک است
ما ز حکم نسبت او ملتیم اہل عالم را پیام رحمتیم

قلبِ مؤمن را کتابش قوت است حکمتش جبل الوریڈ ملت است
فرد از حق ملت ازوے زندہ است از شعاعِ مہر او تابندہ است
حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ رحمۃ اللعالمین تھے، جس طرح اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ رسول اللہ کے ماننے والے بھی اسی نسبت سے پوری دنیا کے لیے رحمت ہیں۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خدا کے آخری رسول ہیں اور امتِ مسلمہ آخری قوم ہے جو خدا کے آخری پیغام کی حامل ہے۔ رسالت کی ساری صفات کی تکمیل محمد الرسول کی سیرت میں ہو گئی ہے۔ اور آپ کی شریعت دین کا اوج کمال ہے۔ اس شریعت پر ایمان رکھنے والی اور اس سیرت کو نمونہ عمل تصور کرنے والی امتِ ملی اصول و عمل کی جامع اور مکمل ترین قوم ہے۔ یہی راز ہے تمام کثرت و تنوع کے باوجود ملتِ اسلامیہ کی اندرونی وحدت و تنظیم کا۔ اسلام پوری انسانیت کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے اور امتِ مسلمہ اسلامی نصب العین کے تحت آفاقی و عالمی طور پر دنیا کے تمام انسانوں کی صلاح و فلاح کی ذمے دار و علم بردار ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرت ہم مدعا وحدت شود پختہ چوں وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت ز بند وحدت است وحدتِ مسلم، زدین فطرت است
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد بر رسول ما رسالت ختم کرد
رواق از ما محفل ایام را اُد رسل را ختم و ما اقوام را

رسالتِ محمدی نے عالمِ انسانیت کو عام حریت، مساوات اور اخوت کا سبق دیا، قیصر و کسریٰ، سلطان و امیر اور اسقف و براہمن سب کے طوقِ غلامی سے انسان کو نجات دلائی، اصحابِ دولت و اقتدار نے عوام کے جو حقوق غصب کر لیے تھے انھیں واپس دلانے، پرانی زندگی کی ساری لعنتیں ختم کر دیں اور ایک نئی زندگی دنیا کو بخشی، جس سے روئے زمین پر خیر و برکت اور ہر قسم کی ماڈی و روحانی ترقیات کا ایک نیا دور شروع ہوا، ایک خدا کی بندگی اختیار کر کے انسان تسخیر کائنات کی تازہ مہم پر آگے بڑھا، معاشرے کی تنظیم جدید ہوئی، جس سے انسان اور انسان کے درمیان سارے مصنوعی امتیازات اور غیر فطری تفرقے ختم ہو گئے، شرافت و عزت کا واحد معیار صرف صالح کردار قرار پایا:

از غلامی فطرت او دوں شدہ نغمہ با اندر نے او خوں شدہ
تا ایمنے حق بہ حق داراں سپرد بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
قوت او ہر کہن پیکر شکست نوع انسان را حصارِ تازہ بست
عصرِ نو کایں صد چراغ آورده است چشم در آغوش او وا کرده است

اقبالیات ۵۹:۳،۱— جنوری- جولائی ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر عبدالمنعمی— رموز بیخودی- اجتماعی خودی کی تشکیل

نقشِ نو بر صفحہ ہستی کشید امنے گیتی کشائے آفرید
مرسلاں و انبیاء آباے او اکرم اوزد حق اتقائے او
کل مومن اخوة اندر دلش حریت سرمایہ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ

در نہادِ او مساوات آمدہ

ملی اخوت و مساوات و حریت کی تمثیل کے لیے اسلامی تاریخ کے تین عبرت انگیز واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ایک جنگِ ایران میں شکست خوردہ لشکر کے سالار جابان کی معافی کا قصہ ہے جسے صرف اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ ایک مسلمان نے اسے امان دے دی تھی اور اسے پوری ملت کی طرف سے امان تسلیم کر لیا گیا:

ہر یکے از ما امین ملت است صلح و کینش صلح و کین ملت است
ملت ار گردد اساس جان فرد عہد ملت می شود پیمان فرد
ایک فرد کی صلح پوری ملت کی صلح ہے اور ایک شخص کا عہد پوری جماعت کا عہد ہے۔

دوسرا قصہ سلطان مراد اور معار کا ہے۔ سلطان نے ایک مسجد بنوائی مگر اس کی تعمیر اسے پسند نہ آئی تو اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ لیا۔ معمار نے قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ سلطان مدعا علیہ بن کر حاضر ہوا اور اس سے حکم قرآنی کے مطابق قصاص طلب کیا گیا، لیکن جب اس نے اپنا ہاتھ کاٹنے کے لیے معمار کے سامنے بڑھا دیا تو معمار نے عدل پا کر احسان کیا، جس کا فرمان بھی قرآن نے دیا ہے، اور سلطان کو معاف کر دیا:

پیش قرآن بندہ و مولا یکے است

بوریا و مسندِ دیبا یکے است

قرآن کی نگاہ میں غلام و آقا ایک دوسرے کے برابر ہیں اور جو اہمیت ریشمی مسند کی ہے وہی چٹائی کی

ہے۔

تیسرا واقعہ کربلا کا دردناک حادثہ ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کے نواسے حضرت امام حسینؑ نے اسلامی اصولِ خلافت کے تحفظ کے لیے بے مثال قربانی دی، نظامِ حکومت میں استبداد کی بدعت پر کاری ضرب لگائی اور توحید کی بخشی ہوئی آزادی کا علم بلند کیا، یہ عقل کی مصلحت کوشی کے برخلاف عشق کی سرفروشی کا کارنامہ تھا، جس سے ایمان و یقین اور خدا کی کبریائی کا ڈنکا قیامت تک بجتا رہے گا اور انسانیت کو راہِ حق میں جرات و بصیرت کا پیغام بھی ملتا رہے گا:

اقبالیات ۵۹:۱:۳— جنوری- جولائی ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر عبدالمنعمی— رموز بیخودی- اجتماعی خودی کی تشکیل

عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را آرام جاں حریت است
تاقیامت قطع استبداد کرد
بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
عشق را عزم و یقین لاینک است
ناقہ اش را سارباں حریت است
موج خون او چمن ایجاد کرد
پس بنائے لا الہ گردیدہ است
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

آفاقی ملت

امتِ مسلمہ مکان کی حد بند یوں سے آزاد ہے، اس کا تعلق کسی خاص سرزمین سے نہیں، یہ آفاق میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسی لیے جب حضرت کعبؓ نے قصیدہ بانٹ سعادت میں رسول اللہؐ کی مدح کرتے ہوئے آنحضرتؐ کو سیف من سیوف اللہ (اللہ کی تلوار) بنا دیا، تاکہ آپ کے وجود کی نسبت کسی ایک ملک کی طرف نہ سمجھی جائے:

قلب ما از ہند و روم و شام نیست
ہمارا قلب ہند و روم و شام کا نہیں، اس کا وطن تو صرف اسلام ہے۔
اسی لیے رسول اللہؐ نے ساری زمین کو مسلمانوں کے لیے مسجد قرار دیا اور ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو کسی ایک مقام میں مقید ہو کر نہیں رہنا چاہیے:

تاز بخشش ہائے آں سلطان دین
صورت ماہی بہ بحر آباد شو
یہی وجہ ہے کہ اسلام وطن پرستی کا مخالف ہے۔ قوم پرستی نے فی الواقع انسان کو انسان سے الگ کر کے قبائلیت پیدا کی ہے، جس سے انسانی اخوت فنا ہو گئی ہے، بنی نوع انسان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور روح اس کے اندر سے نکل گئی ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
تا وطن را شیع محفل ساختند
مردی اندر جہاں افسانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند

بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
نوع انسان را قبائل ساختند
آدمی از آدمی بیگانہ شد
آدمیت گم شد و اقوام ماند

وطن سے ہجرت رسول خداؐ کی سیرت کا ایک نہایت فکر انگیز واقعہ ہے:

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است
اس ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

ہجرت مسلمان کا آئین حیات اور اس کے لیے ثبات و استقلال کا باعث ہے۔

لازوال ملت

ملت اسلامیہ وقت کی قید سے آزاد ہے، افراد کو فنا ہے، مگر اس جماعت اسلامیہ کو بقا ہے جو توحید و رسالت کی بنیادوں پر استوار ہے، یہ امت لازوال ہے، اس کی بے خزاں ہے، زمانے کی دست برد سے مٹا نہیں سکتی، مکان ہی کی طرح اس کا زمان بھی بے کنار ہے، جب تک ملت کا مقصد و حیات موجود ہے اس کا دریا خشک نہیں ہوگا، خواہ تعمیر و تخریب کے کتنے ہی چکر چلیں اور اور گردش ایام کے کتنے ہی نشیب و فراز سامنے آئیں، قوموں کی بھی ایک اجل قرآن کے لفظوں میں ہے، لیکن امت مسلمہ کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے، جیسا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ (ہم نے اپنا کلام نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور يُرِيدُوْنَ اَنْ يُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّا اَنْ يُنۡزِلَ نُوْرَهٗ وَ لَوۡ سَكَرَہُ الْكٰفِرُوْنَ (کفار و مشرکین اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، لیکن خواہ کفار کو کتنا ہی ناگوار ہو اللہ تو اپنا نور مکمل کر کے رہے گا) کی آیات قرآنی سے واضح ہے۔ فتنہ تاتار کا واقعہ بھی ملت اسلامیہ کی بقا کے دوام کا ایک بین ثبوت ہے۔ اس وقت کے ملی مرکز بغداد، کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ مگر امت مسلمہ اپنی جگہ قائم رہی، یہاں تک کہ بغداد کو تباہ کرنے والوں ہی نے اسلام کا علم اٹھالیا اور متعدد مسلم سلطنتیں ان کی فتوحات سے وجود میں آئیں، جن کے ذریعے صدیوں تک انسانیت کی زبردست ترقیات ہوتی رہیں:

ہے عیساں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
ملت اسلامی ملتِ ابراہیمی ہے اور خلیل اللہ کی طرح اس نے وقت کے روشن کیے ہوئے کتنے ہی آتش
کدوں سے گلزار کھلائے ہیں۔ امت مسلمہ ایک نصب العین سے عشق اور خدا اور رسول کی محبت پر مبنی ہے۔ یہ
عشق عالم کے اجزائے پریشاں کو ترکیب دے کر وجود عطا کرتا ہے۔ اس سے ہستی کی سالمیت کا قیام و
استحکام اور اس کی حامل ملت کا استقلال و استمرار وابستہ ہے۔ توحید کی روح اور رسالت کی برکت ملت
اسلامیہ کو لازوال بنانے کے لیے کافی ہے، لہذا اس کے کمالات تا قیامت ظاہر ہوتے رہیں گے، دنیا کا وجود
ہی اس کے دم قدم سے ہے:

فصلِ گل از نسترن باقی تراست از گل و سرو و سمن باقی تراست
ہم چناں از فرد ہائے پے سپر ہست تقویم امم پابندہ تر
زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن زندہ قوم از حفظِ ناموس کہن

مرگِ فرد از خشکی رودِ حیات
از اجل این قوم بے پرواستے
تا خدا ان یطفوا فرموده است
از تہ آتش براندازیم گل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار
در جہاں بانگِ اذال بودست و ہست
عشق آئینِ حیاتِ عالم است
عشق از سوزِ دلِ مازندہ است
گرچہ مثلِ غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

آئینِ ملت

ملتِ اسلامیہ کی تشکیل ایک آئین پر مبنی ہے، جس کے بغیر وہ نہ زندہ رہ سکتی ہے نہ ترقی کر سکتی ہے:
ہستیِ مسلم ز آئین است و بس باطنِ دینِ بنی این است و بس
آئینِ قانونِ فطرت ہے، پتی آئین کے تحت پھول بنتی ہے اور پھول گل دستہ بن جانا ہے، آواز کے
انضباط سے ہی نغمہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ محض شور و غوغا ہوگا، سانس پابند نے ہو کر ایک نوائے دلکش بن جاتی
ہے۔ اس طرح دنیا کی ہر چیز آئین کی خوبی سے قائم ہے اور نشوونما پا رہی ہے، خوب سے خوب تر ہو رہی
ہے۔ انسانیت اور اس کی بہترین جماعت، ملتِ اسلامیہ کا بھی ایک آئین ہے، جو قرآنِ حکیم ہے، یہ
مسلمانوں کا دستورِ حیات ہے، ان کا مایہ و قار ہے، اس کی حکمت لازوال ہے، تکوینِ حیات کا باعث ہے اور
اس سے ثبات و استقلال حاصل ہوتا ہے:

توہمی دانی کہ آئین تو چیست؟ ز پر گردوں سر تمکین تو چیست؟
آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخہ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
کتاب اللہ خدا کا آخری پیغام انسانوں کے نام ہے، یہ مکمل ضابطہ حیات ہے اور بنی نوع انسان کے

لیے ایک پیامِ رحمت ہے:

نوعِ انساں را پیامِ آخرین حامل اور رحمۃ للعالمین

قرآن کے آئین زندگی نے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے، بڑے بڑے رہزن بھی اس کے پابند ہو کر دنیا کے رہبر ہو گئے ہیں:

رہزناں از حفظ اور رہبر شدند از کتابے صاحب دفتر شدند
لیکن مسلمانوں نے قرآن سے بیگانہ ہو کر اپنی ملی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اسی ناپسندیدہ روش کے سبب ان کا عروج وال میں بدل گیا ہے:

قطع کردی امر خود را در زبر جادہ بیبائی الی شیء نکر
بہر حال، اسلامی زندگی قرآن پر پورا پورا عمل کیے بغیر ممکن نہیں، اللہ کی کتاب میں درج آئین پر بہ تمام و کمال کار بند ہو کر ہی مسلمان عزت کی زندگی گزار سکتے اور دنیا میں آگے بڑھ سکتے ہیں، ان کا وجود اور عروج دونوں آئین قرآنی سے ہی وابستہ ہیں:

گر تو می خواہی مسلمانا زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

تقلید بمقابلہ اجتهاد

اقبال فکری و نظری طور پر اجتهاد کو ملی وجود کی تازگی کے لیے ضرور قرار دیتے رہے، مگر عملاً انھوں نے دیکھا کہ آزادی رائے ایک ایسی آزاد روی اور اغیار کی غلام پیدا کر رہی ہے جس سے ملت میں انتشار برپا ہے اور مسلمانوں کا کردار پست ہو رہا ہے، نا پختہ خیالات فقط زمانہ سازی اور مفاد پرستی کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملت کی مرکزیت ختم ہو چکی ہے اور وہ چلتی ہوئی ہواؤں کے رخ پر ناچ رہی ہے۔ لہذا ایک پختہ کار اور صحیح الفکر مدبر کی حیثیت سے اقبال نے تجویز کیا کہ ایک پر آشوب دور میں پہلے سے طے شدہ ضوابط کی تقلید ہی مناسب و مفید ہے:

مضمحل گردد چو تقویم حیات ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہ آبا رو کہ اس جمعیت است معنی تقلید ضبط ملت است
ایسی با اصول تقلید وحدت ملی اور جماعت کے نظم و ضبط کے تحفظ کا باعث ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کی بنا تصور توحید پر استوار ہوتی ہے:

نقش بر دل معنی توحید کن چارہ کار خود از تقلید کن
اسلاف کی تقلید خیر و برکت کی ضامن ہے، اس لیے کہ انھوں نے بڑی احتیاط، نہایت غور و فکر اور کامل بے غرضی دے لوٹی کے ساتھ قرآن و سنت کی روشنی میں معاشرت کے احکام مرتب کیے، انھوں نے منشا شریعت کو صحیح طور پر سمجھا اور جو کچھ تجویز کیا تقویٰ کے ساتھ:

اقبالیات ۵۹:۳، ۱:۵۹ — جنوری-جولائی ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر عبدالمنعمی — رموز بیخودی-اجتماعی خودی کی تشکیل

ز اجتهادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقلِ آبایت ہوں فرسودہ نیست کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرِ شاں رسیدہمی باریک تر ورعِ شاں با مصطفیٰ نزدیک تر
زوال و انحطاط کے دور میں اجتهاد انتشار انگیز ہوتا ہے:

اجتهاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہی چپچہ بساط
تقلید بہر حال آئینِ قرآنی کی ہے جو اللہ کی رسی ہے اور اسے مضبوطی سے تھام لینے کے لیے فرمانِ
خداوندی و اعتصموا بجبل اللہ نازل ہوا۔ ایک آئین کی پیروی سے اتحاد و اتفاق پیدا ہوتا ہے، موتیوں کی
چمکتی ہوئی بیش قیمت مالابنتی ہے، اور نہ انسان غبارِ راہ کی طرح بکھر جاتا ہے:

ازیک آئینی مسلمان زندہ است پیکرِ ملت ز قرآن زندہ است
ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست اعتصامش کن کہ جبل اللہ اوست
چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفته شو

سیرت ملی اور اتباعِ آئین

سیرت ملی یا اجتماعی خودی کی پختگی آئینِ الہی کے اتباع سے ہوتی ہے، اس لیے کہ علم حق شریعت کے
سوا کچھ نہیں اور سنتِ رسول کی پیروی محبتِ رسول کے سبب ہوتی ہے، جو ہر فرد ملت کے قلب و روح میں
جاگزیں ہے۔ نظامِ ملت آئین حق پر عمل سے قائم ہوتا ہے اور اس نظام کی محکمگی ملت کے لیے بقائے دوام کا
باعث ہے۔ اسلام کی حقیقت ہی شرعِ رسول ہے، شریعتِ محمدی سے دین کا آغاز بھی ہوتا ہے اور اسی پر دین
کا انجام بھی منحصر ہے:

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
ملت از آئین حق گیرد نظام از نظام محکمے خیزد دوام
باتو گویم سرِ اسلام است شرع شرع آغاز است و انجام است شرع
دینِ مصطفیٰ دینِ حیات ہے اور شریعتِ محمدی آئینِ حیات کی تفسیر ہے، جو کچھ کتاب اللہ میں درج ہے
سنت اللہ اس کی ہی تشریح و تعمیل کرتی ہے۔ اپنے اقوال و افعال کے ذریعے رسول خدا نے جو کچھ ہدایت دی
ہیں وہ سب احکامِ الہی کے مطابق ہیں۔ اس طرح شریعت دراصل قانونِ قدرت پر عمل کا پیغام اور طریقہ
ہے۔ جو جماعت اُس طریقے پر کار بند ہوگی وہ فولاد کی طرح مضبوط ہو جائے گی۔ ایک سیدسہ پلائی ہوئی

اقبالیات ۵۹:۳،۱— جنوری- جولائی ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر عبدالمنعمی— رموز بیخودی- اجتماعی خودی کی تشکیل

دیوار (بنیان مرصوص) بن جائے گی، جس میں کوئی شکاف نہیں ہوگا، وہ دنیا میں ایک کوہ وقار کے مانند کھڑی ہوگی:

از عمل آہن عصمت می سازدت جائے خوبے در جہاں اندازدت
خستہ باشی استوارت می کند پختہ مثل کوہسارت می کند
ہست دین مصطفیٰ دین حیات شرع او تفسیر آئین حیات
ملت اسلامیہ کے کردار کی استواری عربی صلابت سے وابستہ ہے، نہ کہ عجمی لطافت سے۔ اصلاً یہ
عرب کا سوز دروں اور جذبہ عمل ہے، نہ کہ عجم کی فلسفہ طرازی و تن آسانی، جو ملت اسلامیہ کی طاقت، جمعیت
اور شوکت کا باعث ہے:

قلب رازیں حرف حق گرداں قوی باعرب در ساز تا مسلم شوی
اجتماعی کردار اور اسوہ رسولؐ

اسلامی شریعت کا مثالی نمونہ سیرت رسولؐ ہے، جسے قرآن نے اسوہ حسنہ اور خلق عظیم قرار دیا ہے۔
لہذا افراد ملت کی حیثیت سے مسلمانوں کا اجتماعی کردار اسوہ رسولؐ پر مبنی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے عادات و
اطوار ہی ایک اچھے انسان اور سچے مسلمان کے لیے نمونے کے اخلاق ہیں۔ یہ آپ ہی کے اخلاق کا نتیجہ
ہے کہ مسلمان کی فطرت و خصلت دنیا کے انسانوں کے لیے سراپا رحمت و شفقت ہے۔ ہر فرد ملت ایک قطرہ
نیساں کی طرح ہے جو سیرت رسولؐ کے بحر بے کراں کی تہہ میں بیٹھ کر موتی بن جاتا ہے۔ جو شخص آفتاب
رسالت سے روشنی حاصل کرتا ہے اس کے کردار کی تابانی کبھی ماند نہیں پڑتی، حسن عمل اسے زندہ جاوید بنا دیتا
ہے:

فطرت مسلم سراپا شفقت است در جہاں دست و زبانش رحمت است
آں کہ مہتاب از سر انگشتش دو نیم رحمت او عام و اخلاش عظیم
طینت پاک مسلمان گوہر است آب و تابش ازیم پیغمبر است
آب نیسانی بہ آغوشش در آ ورمیان قلزمش گوہر برآ
در جہاں روشن تر از خورشید شو
صاحب تابانی جاوید شو

ملت کا مرکز محسوس

مظاہر فطرت اور حقائق کائنات کے مشاہدے اور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے کا وجود ارتکاز

سے وابستہ ہے، آگ کی اڑتی ہوئی چنگاریاں مرکز ہو کر لالہ بن جاتی ہیں، ہوا کی بہتی ہوئی لہریں سینے کے اندر مرکز ہو کر سانس بن جاتی ہیں، بکھر ہوئے نباتی عناصر مجتمع ہوتے ہیں تو ایک دانے سے ایک درخت آگ جاتا ہے۔ انسان کی نگاہیں اسی طرح ایک نقطے پر مرکوز ہو کر زندگی کے سارے کمالات دکھاتی ہیں۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ملت کا ایک محسوس مرکز ہو، جو اس کی جمعیت کا سامان کرے۔ ملت کا سارا ربط و نظام مرکزیت سے وابستہ ہے:

ہم چناں آئین میلادِ امم زندگی بر مرکزے آید بہم
حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است خط او در نقطہ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے
زندگی ایک مرکز پر آتی ہے تو ملت پیدا ہوتی ہے، کسی حلقے کے لیے مرکز کی حیثیت جسم میں جان کی ہے، جیسے کوئی بھی لکیر ایک نقطے سے شروع ہوتی ہے، قوم کی ہم آہنگی اور تنظیم اس کے مرکز پر منحصر ہوتی ہے اور اسی مرکزیت سے اسے استقلال و استحکام نصیب ہوتا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا مرکز محسوس خانہ کعبہ ہے، جو امتِ مسلمہ کے تمام سوز و ساز کا سرچشمہ ہے، حرم کے ساتھ تعلق کے سبب ہی ہم زندہ ہیں اور جب تک اس کا طواف کرتے رہیں گے پابندہ ہوں گے، ہماری اجتماعیت حرم کعبہ پر مبنی ہے:

راز دار و رازِ ما بیت الحرم سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم
تو ز پیوندِ حریمی زندہ تا طواف او کنی پابندہ
در جہاں جان امم جمعیت است در نگر سر حرم جمعیت است
لامركزیت کی تباہیوں کے لیے سب سے عبرت ناک مثال یہودیوں کی ہے، جو پوری دنیا میں بکھرے ہوئے اور دوسری قوموں کے رحم و کرم پر ہیں، ان کا اپنا کوئی مستقل بالذات مرکز ایسا نہیں جو ان کے بل بوتے پر قائم ہو۔ چنانچہ ان کی فطرت و سیرت مسخ ہو چکی ہے اور وہ انسانی تاریخ کی سب سے مردود قوم بن گئے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو اپنے حرم کی قدر و منزل اور اہمیت و عظمت سے آشنا ہونا چاہیے۔ کعبے میں سجدہ ریز ہو کر اور اس کے نیاز مند بن کر ملت کے اسلاف نے ایک عالم میں ہنگامہ بپا کر دیا تھا اور پوری دنیا ان کی ناز برداری کرنے لگی تھی۔ لہذا آج کے مسلمانوں کو اپنے جلیل القدر اسلاف کے رستے پر چل کر ان ہی کے جیسا اعزاز و اکرام حاصل کرنا چاہیے:

مثل آبا غرق اندر سجدہ شو آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو
مسلم پیشیں نیازے آفرید تابہ نازِ عالم آشوبے رسید

ملت کا نصب العین: توحید

مدعا و مقصد مایہ وجود ہے، ہستی کا سارا کارخانہ کسی نشانے تک پہنچنے کے لیے چل رہا ہے، بغیر منزل مقصود کے سفر حیات ممکن نہیں، نصب العین اور مطمح نظر ہی سے انسان میں حرکت عمل پیدا ہوتی ہے، اس کی ساری سرگرمیاں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہیں، مدعا کا تقاضا آدمی کے اندر ہمت بھی پیدا کرتا ہے اور قوت بھی، تمام عزائم اور آرزو میں مقصود کی کشش سے ابھرتی ہیں، دنیا ایک صحرا ہے اور انسان ایک محمل کے تعاقب میں دوڑ رہا ہے، جو اس کی نگاہوں کے اُفق پر ہمیشہ موجود ہے اور اگر وہ اس سے ایک لمحہ بھی غافل ہو جائے تو یہ محمل نظروں سے پوشیدہ ہو جائے گا۔ پھر منزل کی طرف جانے والے راستے کے فاصلے ناقابل عبور ہو جائیں گے۔ کائنات کا ایک منہتا ہے جس تک وہ صدیوں کے بعد اور لا تعداد مراحل طے کر کے پہنچی ہے، کتنے ہی نقوش لوح زندگی پر ثبت ہوئے، کتنے ہی باطل خداوندوں سے سابقہ پڑا، تب دنیا میں اذیاں کی آواز نوائے حق بن کر گونجی، ایمان کا غلغلہ بلند ہوا، توحید کا کلمہ انسان کی زبان پر جاری ہوا، لا الہ الا اللہ نقطہ پر کار حق اور منہتائے کائنات ہے۔ یہی وہ آفاقی صداقت ہے جس کی برکت سے آسمان کے طبقات قائم ہیں، آفتاب روشن ہے، دریا میں موج تڑپ رہی ہے اور سمندر کی تہہ میں موتی بن رہے ہیں، مٹی پھول کھلا رہی ہے، بلبل زمزمہ سنچ ہے، انگور کے خوشے چمک رہے ہیں۔

ملت اسلامیہ کا نصب العین یہی توحید ہے، جس کے نشر و اشاعت کے منصب پر وہ مامور کی گئی ہے، کائنات میں تکبیر کا بول بالا کرنا ہی ملت کا مقصد وجود ہے۔ انسان تاریخ میں طرح طرح کی بت سازیاں کرتا رہا ہے، عصر حاضر نے بھی رنگ و نسل اور ملک و نسب کے اصنام تراش لیے ہیں، جن کی پرستش آج کی متمدن دنیا میں ہر جگہ ہو رہی ہے اور ان جھوٹے خداؤں کی قربان گاہ پر انسانیت کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ نمرود و آزر کے اس دور تباہی میں مسلمان کو ابراہیم خلیل اللہ کی طرح کامل و خالص توحید کا علم اٹھا کر سارے باطل خداؤں کے سرکچل دینے چاہیں اور بنی نوع انسان کو ان کے چنگل سے چھڑکا کر ادلا کر امن عامہ سے ہم کنار کرنا چاہیے، تاکہ تخریب کے بجائے تعمیر کا دور دورہ ہو اور کاروان حیات ارتقا کی اگلی منزلوں کی طرف قدم بڑھا سکے:

چوں حیات از مقصدے محرم شود	ضابطہ اسباب این عالم شود
ہیچو جاں مقصود پنہاں در عمل	کیف و کم ازوے پذیرد ہر عمل
مدعا مضراب ساز ہمت است	مرکزے کو جاذب ہر قوت است
تخم ایماں آخر اندر گل نشاند	بازبانہ کلمہ توحید خواند

نقطہ ادوار عالم لا الہ
زائکہ در تکبیر رازِ بودِ تست
فکرِ انساں بت پرستے بت گرے
باز طرح آزری انداخت است
اے کہ خوردتی زمینای غلیل
برسر این باطلِ حق پیر ہن
انتہائے کار عالم لا الہ
حفظ و نشر لا الہ مقصود تست
ہر زماں در جستجوی پیکرے
تازہ تر پروردگارے ساخت است
گریمِ خونت ز صہبائے غلیل
تتج لا موجود الا هو بزن
ہر دور کی طرح عصر حاضر میں بھی صرف ملت اسلامیہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک بار پھر توحید کا
نعرہ بلند کرے گی، اس لیے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کی حامل ہے اور دین اسلام کی تکمیل اس شریعت محمدی
پر ہی ہوئی ہے جس کی حامل تاریخ میں ملت اسلامیہ رہی ہے، لہذا وہی آج کی جاہلیتِ جدیدہ میں حق کا نور
پھیلا کر بڑھتی ہوئی تاریکی کو دور اور زمانے کو روشن کر سکتی ہے:

جلوہ در تاریکی ایام کن
آں چہ بر تو کامل آمد عام کن

تسخیر کائنات

توحید ایمان بالغیب ہے۔ ایک حاضر و ناظر خدا پر یقین انسان کو کائنات کی تمام غیبی قوتوں پر دست
رس کے لیے ابھارتا ہے، جب کہ موجودات کی تسخیر اس کا مقصد وجود ہے، جو خدا کا ہو جاتا ہے پوری خدائی
اس کی ہو جاتی ہے، خدا کو ماننے والا آدمی ہر قسم کی قیود و حدود سے آگے نکل جاتا ہے، اس کا مطلب ایک
لامکاں، ہستی، ازل ہے، جس کی تلاش میں اسے ابد تک سرگرداں رہنا چاہیے۔ لہذا تمام محسوسات پر قابو
حاصل کرنا انسانیت کا نصب العین ہے، ساتھ ہی کائنات کے سارے اسرار و رموز کا تجسس اس کی
فطرت میں داخل ہے:

اے کہ بانایدہ پیماں بستہ
ہستی حاضر کند تفسیر غیب
ہمچو سیل از قید ساحل رستہ
می شود دیباچہ تسخیر غیب
ماسوا از بہر تسخیر است و بس
سینہ او عرضه تیر است و بس
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالی از ذرہ تعمیر کرد

لہذا عالم اسباب سے صرف نظر کرنے کے بجائے اس کے ساتھ پورا پورا اعتنا و التفات کرنا چاہیے،
دنیا مسلم کی خودی کی توسیع و ترقی کے لیے ہے، تاکہ اس کی شخصیت کے تمام امکانات بروئے عمل

اقبالیات ۵۹:۱:۳ — جنوری-جولائی ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر عبدالمنعمی — رموز بیخودی-اجتماعی خودی کی تشکیل

آئیں، جہاں اختیار و صالحین کے لیے ہے، اس کا مشاہدہ و مطالعہ کرنا ہے، نفس کی معرفت کے ساتھ ساتھ آفاق کا عرفان مومن کو معیار وجود پر پورا اترنے کے قابل بنانا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم عالم کی تسخیر نہ کریں گے تو عالم ہمیں مسخر کر لے گا:

اے کہ از تاثیر ایوں نختہ	عالم اسباب را دول گفتم
غائش توسیع ذات مسلم است	امتحان ممکنات مسلم است
حق جہاں را قسمت نیکاں شمرد	جلوہ اش بادیدہ مومن سپرد
کارواں را رہ گزار است این جہاں	نقد مومن را عیار است این جہاں
گیراو را تانہ او گیرد ترا	
ہچو نے اندر سببو گیرد ترا	

نظام کائنات پر قابو حاصل کر کے ہی انسان تکمیل ذات کر سکتا ہے، وہ نایب حق ہے، لہذا عناصر پر اس کا حکم چلنا چاہیے۔ مومن کو پانی سے بجلی اور دھوپ سے روشنی پیدا کرنی ہے، اسے پوری تدبیر کے ساتھ اشیا کی حقیقت کا سراغ لگانا اور اس سے مصرف لینا ہے۔ اس طرح فطرت کی قوتوں کا استعمال کر کے انسان برق و حرارت پر سوار ہو چکا ہے اور مزید انکشافات و ایجادات کے بعد اپنے خلائی سفر میں مادی کائنات کی آخری حد تک جا سکتا ہے، جب کہ اس کی روحانی طاقت بھی انتہائی حد تک بڑھ چکی ہوگی۔ آدم خاکی کا سارا اعتبار ”علم آدم الاسماء کلہا“ کی تعلیم پر عمل سے ہی قائم ہے، ایک ناپیدا کنار کائنات میں حکمت اشیا کا علم و تجربہ ہی انسان کے تحفظ کا سب سے بڑا قلعہ اور اس کی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے:

تاز تسخیر قوائے این نظام	ذو فنونہائے تو گردد تمام
نایب حق در جہاں آدم شود	بر عناصر حکم او محکم شود
تابش از خورشید عالم تاب گیر	برق طاق افروز از سیلاب گیر
جتو را محکم از تدبیر کن	انفس و آفاق را تسخیر کن
چشم خود بکشا و در اشیا نگر	نشہ زیر پردہ صہبا نگر
آں کہ بر اشیا کند انداخت است	مرکب از برق و حرارت ساخت است
علم اسما اعتبار آدم است	
حکمت اشیا حصار آدم است	

ملی خودی کا انفرادی احساس اور پاسِ روایات

جس طرح ایک بچہ بالغ ہو کر گرد و پیش کا فہم حاصل کرتا اور اپنے ماحول کی حقیقت سمجھتا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی کا کمال یہ ہے کہ جماعت اسی شدت کے ساتھ اپنی خودی کو محسوس کر لے جس شدت کے ساتھ ایک فرد اپنی ذات کا احساس کرتا ہے۔ یہ ملی احساس اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی روایت کا پورا پورا تحفظ کیا جائے، اپنی تاریخ ہمیشہ ذہن میں تازہ رکھی جائے، ملی سرگزشت فراموش نہ کی جائے۔ تاریخ کوئی داستان نہیں، یہ واقعات کی ایک زنجیر ہے، سلسلہ روز و شب پر نظر رکھ کر ہی دنیا میں کچھ کیا جاسکتا ہے، قومی کمالات کو یاد رکھنے سے ملی شعور بیدار رہتا ہے اور ہر فرد ملت کو عمل پر ابھارتا ہے، جس سے گردشِ ایام کے درمیان پائنداری حاصل ہوتی ہے:

صد گرہ از رشتہ خود وا کند تا سرِ تارِ خودی پیدا کند
گرم چوں افتد بہ کارِ روزگار ایں شعورِ تازہ گردد پائندار
قوم روشن از سوادِ سرگزشت خود شناس آمد زیادِ سرگزشت
ربط ایام است مارا پیرہن سوزنش حفظِ روایاتِ کہن
زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ لہذا اجتماعی وجود اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب ملی تاریخی محفوظ ہو۔

حیات ایک وحدت ہے۔ لہذا ماضی و حال و مستقبل کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رہنا چاہیے:
ضبط کن تاریخ را، پایندہ شو از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو
سرزند از ماضی تو حالِ تو خیزد از حال تو استقبال تو
زمانے میں لازوال ہونے کا نسخہ یہی ہے کہ فرد جماعت کی موجودہ، گزشتہ اور آئندہ تاریخ کے ساتھ مربوط رہے۔ تسلسل کا یہ ادراک زندگی کی سب سے بڑی علامت اور کسی وجود کی بے خطا شناخت ہے:

مشکن آر خواہی حیاتِ لازوال رشتہ ماضی ز استقبال و حال
موجِ ادراکِ تسلسلِ زندگی است مے کشاں را شورِ قلقلِ زندگی است
یعنی ملت کے تاریخی واقعات کا مربوط احساس دراصل دنیا میں زندگی کے تسلسل کا ادراک ہے، ہر لمحے کے ساتھ دوسرا لمحہ پیوستہ ہے، حال کے ایک سرے پر ماضی ہے تو دوسرے سرے پر مستقبل، ان دونوں کی جامعیت ہی حال کو با معنی اور نتیجہ خیز بناتی ہے، صراحی سے قطرہ قطرہ شراب ٹپکتی ہے اور اس ترشح سے قلقل کی آواز بلند ہوتی ہے، جسے سن کر ہی مے کشوں کو زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور ان کی روح سرشار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ملی روایات کا مطالعہ افراد کے عزائم بلند کرتا اور انہیں جینے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ

عطا کرتا ہے، وہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے اپنے کردار کے لیے ایک نمونہ حاصل کرتے ہیں، ان کے اندر جوش عمل پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑی امنگ کے ساتھ اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔

امت اور امومت

امت اور امومت دونوں الفاظ کی اصل ایک ہے، اُم۔ اس طرح ملت اسلامیہ کی خودی کے لیے ماں کی حیثیت سے عورت کا رتبہ بہت بلند اور اہم ہے۔ اسی لیے تاریخ انسانی میں اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے وہ نہ تو جدید آزادی نسواں دے سکی نہ قدیم غلامی نسواں، کہیں افراط ہے تو کہیں تقریب، توازن صرف اسلام میں ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے قرآن کے لفظوں میں عورت مرد کا لباس ہے، جس طرح مرد عورت کا لباس ہے، یعنی دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں، ایک کا وجود دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ لہذا شریعت محمدی نے سماج اور خاندان پر عورت کے حقوق نہایت اعتدال و انصاف کے ساتھ معین کر دیے ہیں۔ اسلامی سماج میں عورت کی ایک مستقل ہستی اور خودی ہے، جس کی ترقی کے لیے وہ اپنے مخصوص دائرہ عمل کی حدود میں کام کرتی ہے۔ مرد ہی کی طرح عورت ایک خاندان کی فرد ہے اور اس کا وجود چند رشتوں سے محکم ہوتا ہے، وہ محض عورت اور علامت جنس نہیں ہے جس سے مرد آزادی اور برابر کے نام پر کھیلتے اور اس کی آبرو لوٹ کر اسے اپنی خواہشات نیز مفادات کے لیے استعمال کرتے رہیں، جیسا جدید مغربی تمدن و تہذیب میں ہو رہا ہے، بلکہ عورت کسی کی بیٹی ہے، کسی کی بہن، کسی کی بیوی اور سب سے بڑھ کر کسی کی ماں، جس طرح مرد باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا ہے۔ رشتے کا یہی وہ تقدس ہے جس کے پیش نظر ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اولاد ماں کے آغوش تربیت میں پرورش پاتی ہے اور بچوں کے کردار پر بہت ہی فیصلہ کن اثر ماں کے اخلاق کا پڑتا ہے۔ اس طرح آئندہ نسلوں اور انسانیت کے مستقبل کا مدار ماں کی حیثیت سے عورت کی سیرت پر ہے۔ عصر حاضر کی غیر متوازن تمدنی ترقیات میں انسانی سماج کی یہ بنیادی حقیقت فراموش کر دی گئی ہے، مغربی سماج نے زن کو نازن بنا دیا ہے، یورپ اور امریکہ کا معاشرہ مرگ امومت سے دوچار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جتنی جتنی صنعتی ترقیات ہو رہی ہیں معاشرتی الجھنیں اتنی ہی بڑھتی جا رہی ہیں، خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور انسان کی حیثیت سے نئی نسلوں کا مستقبل ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ انفرادی و اجتماعی دونوں قسم کی خودی کے تحفظ کے لیے وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ لہذا اشد ضرورت ہے کہ بقائے نوع کے لیے اسلامی تصور امومت کی اہمیت کو سمجھا جائے اور اسلام نے خواتین کے تحفظ و احترام کے لیے جو ضابطہ حیات تجویز کیا ہے اس پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ اس ضابطے کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں کی عفت و حیا کے لیے سازگار ماحول پیدا

کیا جائے، جس میں بے پردگی، عریانی فحاشی، آزادانہ اختلاط مرد و زن اور ہوس رانی نہ ہو:

اسلام

پوششِ عریانی مرداں زن است	حسنِ دل جو عشق را پیرہن است
از امومت پختہ تر تعمیر ما	در خطِ سیمائے او تقدیر ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے	حرفِ امت نکتہ ہا دارد بے
ملت از تکریمِ ارحام است و بس	ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتارِ حیات	از امومت کشفِ اسرارِ حیات

مغرب

شوخی چشم و فتنہ زا آزادیش از حیا نا آشنا آزادیش
علم او بارِ امومت بر نتافت بر سر شامش یکے اختر نتافت
ایک عورت کا مثالی نمونہ حضرت فاطمہ زہراؑ بنت رسول کی شخصیت ہے، جو ختم الرسلؐ کی دختر ہونے کے ساتھ ساتھ شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زوجہ مکرمہ اور حضرت امام حسینؑ کی والدہ محترمہ ہیں۔ ان کی زندگی کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اخلاق سے گھر کا ایک ایسا ماحول بنایا جس میں شہید کر بلا جیسے مرد حق کی پرورش ہوئی۔ اس ماحول میں خدا کی بندگی، احکام رسول کی اطاعت، شریعت کی پابندی شوہر کے ساتھ وفاداری، اولاد کی تربیت اور ضرورت مندوں کی خدمت کے عناصر نمایاں تھے، صبر و شکر کے ساتھ دنیا کے ہر کام اور وقت کے ہر لمحے میں رضائے الہی کے حصول کی کوشش ہوتی تھی، اپنے معاملات میں قناعت و احتیاط اور دوسروں کے ساتھ ہم دردی و غم خواری کی جاتی تھی، پورا خاندان و قارواہن کا ایک نمونہ تھا:

آں یکے شیعِ شبستان حرم	حافظِ جمععی خیر الامم
مزرعِ تسلیم را حاصل بتول	مادراں را اسوۂ کامل بتول
بہر محتاجے دلش آں گو نہ سوخت	با یہودے چادرے خود را فروخت
آں ادب پروردہ صبر و رضا	آسیا گرداں و لب قرآن سرا

خلاصہ مباحث

مثنوی اسرار و رموزِ خودی و بیخودی کے تمام مباحث و مضمرات کا خلاصہ سورہ اخلاص ہے، جس کی ہر آیت خودی کے کسی نکتے پر مشتمل ہے۔ اس طرح خودی کا جو فلسفہ اقبال نے مثنوی میں پیش کیا ہے وہ ان کے بقول قرآن بالخصوص اس کی ایک مختصر ترین سورہ سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ شاعر نے مذکورہ سورہ کی آیات

کی تفسیر اپنے اشعار سے کی ہے۔

قل هو اللہ احد (کہو اللہ ایک ہے)

خودی کا اصل الاصول توحید ہے، معرفتِ نفس معرفتِ رب کے بغیر ممکن نہیں، یہ ایک خدا کے اقرار ہی کا فیض ہے کہ انسان کو صحیح معنی میں عرفانِ ذات حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی حدود اور امکانات دونوں سے بیک وقت آگاہ ہو جاتا ہے، جس کے سبب اس کے شعورِ ذات میں اعتدال اور اس کے مطابق عمل میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ زندگی میں حقیقت پسندی حق شناسی پر ہی مبنی ہے۔ وحدتِ الہ کا تصور طبیعت میں یک سوئی سیرت میں ہمواری اور کردار میں استواری پیدا کرتا ہے۔ توحید فرد اور سماج کے اندر مرکزیت قائم کرتی ہے۔ مسلم کا مطلب ہی ہے کہ ایک خدا کی بندگی یہ بندگی ایسی بلندی کا باعث ہے کہ پوری کائنات انسان کے لیے مسخر ہو جاتی ہے اور اس کی شخصیت اشرف المخلوقات بن جاتی ہے۔ اسی لیے صیغۃ اللہ کی آیت کے علاوہ حدیث رسول ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ یعنی اپنے اندر صفات الہیہ یا اسمائے حسنیٰ کی خصوصیات پیدا کرو۔ ملی اتحاد و اتفاق بھی توحید ہی پر عمل کا عطیہ ہے۔ ایمان کا اعتبار عمل سے ہے، ایک فرد ایک سماج کے اندر عمل کر کے وجود کی آفاقیت کی شہادت دیتا ہے:

ایں کہ در صد سینہ چپچد یک نفس
سرے از اسرار توحید است و بس
رنگ او برکن مثال او شوی
در جہاں عکس جمال او شوی
آں کہ نام تو مسلمان کردہ است
از دوئی سوے یکی آور دہ است
با یکی ساز، از دوئی بردار رخت
وحدتِ خود را مگر داں لخت لخت
یک شود توحید را مشہود کن
نائش را از عمل موجود کن
لذتِ ایماں فرزاید در عمل
مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

اللہ الصمد (اللہ بے نیاز ہے)

خدا کی بے نیازی اس پر ایمان رکھنے والے کو بھی بے نیاز بنا دیتی ہے، مومن مسوا اور غیر اللہ کی غلامی و تابعداری سے آزاد ہو جاتا ہے، خدا کے سوا اس کا سر کسی کے آگے نہیں جھکتا، اس کی سرفرازی کے سامنے کائنات کی ہر قوت پست ہو جاتی ہے، ایک عاف باللہ مرد فقیر جیسے امام مالک، ایک زبردست بادشاہ، جیسے ہارون رشید کے دربار میں حاضر ہونے کے بجائے اسے اپنے دربار میں لاتا ہے، جو دیا رسول میں واقع ہے، خود دار اور بے غرض انسان دنیا کی کسی طاقت کا نیاز مند نہیں ہوتا، اس کا صرف ایک رنگ ہوتا ہے، اللہ کا رنگ، جس کے ساتھ دوسرے کسی کا رنگ اس کو گوارا نہیں جو انسان اپنی اس حقیقت کو بھول جاتا ہے وہ نسخہ کیمیا کو چھوڑ کر خاک بہ سر ہو جاتا ہے اور اپنی رسوائی کا سامان کرتا ہے۔ آدمی کو پروانے کی طرح دوسرے کی روشنی کیگرددطواف نہیں کرنا چاہیے، شمع کی طرح اپنے نور باطن سے جو نور خداوندی ہے روشن ہونا اور پوری دنیا کو روشن کرنا چاہیے۔ وہی فرد صحیح معنی میں فرد ہے جو اپنی شناخت رکھتا ہے اور وہی قوم صحیح معنی میں قوم ہے جو صرف اپنی ملی خصوصیات پر اعتماد کرتی ہے۔ مسلمان کے لیے ایک خدا کی بندگی کافی ہے:

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردشِ دولاب نیست
مسلم استی بے نیاز غیر شو
اہل عالم را سرا پانیر شو
بے نیازی ناز ہا دارد بے
ناز او انداز ہا دارد بے
بے نیازی رنگ حق پوشیدن است
رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است
بر دلِ خو نقشِ غیر انداختی
خاک بردی کیمیا در باختی
تاکجا طوفِ چراغِ محفلے
ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے
فرد فرد آمد کہ خود را وا شناخت
قوم قوم آمد کہ جز باخود نہ ساخت

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از ارباب دون اللہ شو

لم یلد و لم یولد (خدا نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا)

اسلامی تصور کے مطابق خدا کا تو الد و تناسل سے بالا ہونا عام انسانی اخوت و مساوات کی ضمانت ہے۔ کسی خاص انسان کے ساتھ خدا کا کوئی ذاتی رشتہ ناطہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حدیث رسول کے مطابق تمام مخلوقات اللہ کا کنبہ (الخلق عیال اللہ) ہیں اور ان کے درمیان حسب نسب، منصب، رنگ وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ لہذا اگر ملت اسلامیہ کے اندر رنگ و خوں کا کوئی امتیاز کیا جانا ہے تو اس سے ملی اخوت پر ضرب پڑتی ہے:

قوم تو از رنگ و خوں بالاتر است
قیمت یک اسودش صد احمر است
گر نسب را جزو ملت کردہ
رخنہ درکار اخوت کردہ

توحید کی علم بردار ام مسلمہ کے اندر اس تفرقے کی کوئی گنجائش اصولاً نہیں پائی جاتی۔ تمام افراد ملت عالمی سطح پر ایک خدا کے ساتھ ایک ہی رسول کے ماننے والے اور ان سے محبت رکھنے والے ہیں، رسول خدا کی یہ الفت ان کی ہم آہنگی کے لیے کافی ہے، قوم رسول ہاشمی ایک خاص ترکیب کی حامل ہے، جو دوسری ملتوں کے برخلاف ملک و نسب کی حد بندیوں سے پر لے ہے، ایمان اللہ کے ساتھ ساتھ صرف عشق رسول اہل اسلام کی جمعیت کا سرمایہ ہے یہی مسلمانوں کا دین و ایمان ہے، خدا و رسول کے احکام و ہدایات پر بے چون و چرا عمل کرنا ہی ان کی شان ہے:

نیست از روم و عرب پیوند ما
نیست پابند نسب پیوند ما
دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک و گر پیوستہ ایم
رشتہ ایک تو لایش بس است
چشم ما را کیف صہبایش بس است

عشق او سرمایہ جمعیت است
بچو خوں اندر عروقی ملت است

و لم یکن له کفو احد (کوئی خدا کا ہمسر نہیں)

خدا کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ چنانچہ اس کے بندوں کا بھی کوئی حریف و ہمسر نہیں۔ ایک آیت قرآنی کے مطابق اہل ایمان اپنے کردار کی بنا پر دوسروں سے بلند تر ہیں: و انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ مسلمان صحیح معنی میں بندہ مولا صفات ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفرین، کارکشہ، کارساز

(مسجد قرطبہ-بال جبریل)

اسی حیثیت سے مسلمان دوسرے انسانوں کے ساتھ عفو و عدل اور احسان و فیاضی سے کام لیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا قہر بھی اللہ کی مخلوقات کے لیے ایک کرم ہے، اس لیے کہ وہ ظلم و ستم کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا اور باطل کا پتہ مڑوڑ کر بنی نوع انسان کے لیے امن و امان اور سکون و راحت کا سامان کرتا ہے، اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے ہے اور دشمنی بھی اللہ کے لیے:

آں کہ ذآش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم ورنہ سازد باشریک
مومن بالائے ہر بالاترے
غیرت او بر نتابد ہمسرے
خرقہ لا تحزنوا اندر برش
انتم الاعلون تاجے برسرش
عفو و عدل و بذل و احساس عظیم
ہم بہ قہر اندر مزاج او کریم

اس طرح مومن کی اجتماعی نیز انفرادی خودی اس کی اپنی شخصیت کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ پورے انسانی معاشرے کی ترقی کا باعث ہے، اس کی خودی و بے خودی دونوں سے صلاح و فلاح کا سامان ہوتا ہے۔ لیکن عصر حاضر میں مسلمانوں کی یہ خودی گم ہو چکی ہے اور وہ دنیا میں ہر جگہ قومیت اور وطن پرستی کے

اندر مبتلا ہو کر اپنے انسانی و آفاقی مشن سے غافل نظر آرہے ہیں۔ یہ ان کی پستی اور زوال کی نشانی ہے، ورنہ معراج مصطفیٰ کا سبق تو یہ ہے کہ ”عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں“، مسلمان ایک ناوک ہے اور ”ہدف اس کا ہے ثریا“، لہذا اس کا نعرہ ہونا چاہیے ”ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں“، اس لیے کہ مہر و ماہ و مشتری اس کے ہم عنان نہیں، اس کی منزل تو چرخ نیلی فام سے پرے ہے:

تا کجا در خاک می گیری وطن
رخت بردار و سر گردوں گلن

خاتمہ کلام

اقبال کے نظریہ خودی کا یہ ولولہ انگیز کلام ”عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین“ پر ختم ہوتا ہے۔ اس خاتمہ کلام میں مفکر شاعر نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ یہ ایک سوانحی اعتراف ہے، جس سے اس جذبے کا پتہ چلتا ہے جو اسرار و رموز خودی و بے خودی کی تصنیف کا محرک ہوا۔ اس اقرار نامے میں گرچہ خطاب بہ رسول ہے، مگر گویا خدا کو حاضر و ناظر جان کر شاعر نے اپنے افکار میں پنہاں خلوص کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح قاری کو اعتماد میں لے کر یہ بتانے کی بلیغ کوشش کی گئی ہے کہ زمزمہ سنجی سے مقصود محض شاعری نہیں ہے۔ بلکہ ایک ملت اور اس کے ذریعے پوری انسانیت کے ذہن و ضمیر کو بھونٹنا ہے۔ اپنے نصب العین کے سلسلے میں شاعر نے وضاحت کی ہے کہ اس کا منبع قرآن حکیم ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ عصر حاضر میں ملت اسلامیہ توحید سے بیگانہ اور اپنے قبلاً نظر سے روگرداں ہو چکی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے جسم سے روح نکل چکی ہے۔ لہذا اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے اور اس کے وجود میں ایک نئی روح پھونکنے کے لیے فلسفی ذکا نے مسلمانوں کو ایک بار پھر قرآن کے نظریہ توحید اور نظام مصطفیٰ کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیا ہے۔ توحید کے علم بردار عاشق رسول کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دور جدید میں امت مسلمہ کا اصل مرض ایک قسم کا شرک ہے اس لیے کہ اس نے اسلامی شریعت کے تجویز کردہ نظام حیات کو عملاً و عموماً ترک کر کے اپنے دماغ میں غیر اسلامی تصورات کا ایک بت خانہ سجا لیا ہے اور زندگی کے اجتماعی خودی مجروح ہو چکی ہے اور اس کے افراد میں شخصی خودی کا احساس بھی باقی نہیں رہا، وہ غیروں کی بندگی کر کے خود بھی رسوا ہو رہے ہیں اور ملت اسلامیہ کی ذلت کا بھی سامان کر رہے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اپنی اس تباہ کن روش سے تائب ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور شریعت محمدی کو اپنا دستور العمل بنالیں تاکہ آج کی دنیا میں وہ اپنے گم شدہ قائدانہ مقام کی بازیافت کے بعد عالم انسانیت کی رہنمائی حقیقی ترقی کی بلند تر منزلوں کی طرف کر سکیں۔ اسلام کی اسی نشاۃ ثانیہ میں امت مسلمہ اور بنی نوع انسان کی نجات ہے:

مسلم از سر نبی بیگانه شد
باز این بیت الحرم بت خانه شد

شیخ ما از برہمن کافر تراست
زاں کہ اور اسومنات اندر سراست
نعشش از پیش طیبیان برده ام
در حضور مصطفیٰ آور دہ ام
مرده بود از آپ حیواں گفتمش
سرے از اسرار قرآن گفتمش
محفل از شمع نوا افروختیم
قوم را رمز حیات آموختم
عرض کن پیش خداے عزو جل
عشق من گردد ہم آغوش عمل
دولت جان حزیں بخشندہ
بہرہ از علم دین بخشندہ
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آب نیسانم گہر گرداں مرا

(ڈاکٹر عبدالمنفی— اقبال کا نظریہ خودی)



